دینی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا علمبردار

جولائی 2011ء

ماہنامہ

فہمِ دین

- ایک خوش قسمت شہیدِ محبت
- پچھتانے سے پہلے



عورت بنی تو معاشرہ بنا

Examination Year Book

شارٹ کٹ کلچر...
طلباء کے لیے زہرِ قاتل

بے بسی کی ہنڈیا

بے بسی کی ہنڈیا

محمد ابوبکر صدیق



رات اندھیرے کی سیج پر لوٹ رہی تھی..... خاموشی فضا کے پنجرے میں محبوس تھی..... سناٹا غم ناک بلبل کی طرح گا رہا تھا..... پہاڑیوں کے درمیان کوئی سانپ سا بل کھاتا راستہ، چند بچوں کی بے آرام، سسکیوں کی بازگشت بار بار دہرا کے سن رہا تھا..... وہ آواز کو پہاڑ پر مارتا، باز گشت سنتا، پھر بے چین ہو کر پہلو بدلنے لگتا..... اضطراب اس کی کمر پر ننگے پاؤں دوڑ رہا تھا..... اس کی پریشانی بڑھی تو اس نے کچھ سسکیاں کچے چھپڑ کی طرف جانے والی ہوا کی چونچ میں امیر المؤمنین کے نام سربمہر کر کے دے دیں۔

●●●

''بائیس لاکھ مربع میل.....!''

''دجلہ وفرات کے کندھے پر کوئی بکرا یا کتا بھوکا تو نہیں.....؟''

بے چینی اسے ستائے جا رہی تھی..... اس دوران تھکاوٹ اسے نیند کے کارزار میں لے آئی، جہاں اسے نیند سے معرکہ لڑنا تھا..... مگر پھر اسے تنہا چھوڑ گئی..... چند لمحوں کے بعد وہ بے چارگی کے عالم میں کہنگی کی ماری دو چادروں سے اٹھا اور شنوائی کے قدموں سے مسلی ہوئی فریادیں تلاشنے شہر کی گلیوں میں آ گیا..... یہاں کوئی نفس نہیں تھا، ہُو کا عالم طاری تھا اور بے چینی فضا میں رچی ہوئی تھی..... آخر کسی لمحے مریل سی آہوں نے اس کی بے چینی کو دلاسہ دیا اور اسے ایک شکستہ مکان کے دروازے تک کھینچ لائی۔

●●●

مکان کیا تھا؟..... بوسیدگی سے لپٹی ہوئی دیواریں..... جن کا کچھ احاطہ ستم رسیدگی سے چھٹا ہوا تھا..... رحمتِ عالم کے جوار میں چند نفوس معاشرے کی بے اعتنائی اور بھوک سے نڈھال زمین پر پڑے تھے..... چند معصوم پھول تھے جنہیں خونخوار بھوک تھپڑ مار مار کر رونے پر مجبور کر رہی تھی..... ایک ممتا تھی جو کبھی دروازے میں کھڑی ہو کر اندر ہی اندر امیر المؤمنین کو بلاتی تھی، کبھی معصوم پھولوں کے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کو زندگی کی منتیں کرتی تھی..... بے چین ممتا ہاجرہ کی طرح صحن اور دروازے تک کے کئی چکر لگا چکی تھی..... سامنے چولہے میں معاشرے کی لاپرواہی کی آگ جل رہی تھی..... اوپر بے بسی کی ہنڈیا میں ماں بیٹوں کی آرزوئیں ابل رہی تھیں..... بلبلوں کی طرح اٹھتی خواہشیں، بھاپ بن بن کر اڑ رہی تھیں.....

غربت میں اور رکھا ہی کیا ہے؟..... سماج کی ناانصافی کی آگ..... شعلے، لپٹیں اور دھواں..... جو چاہتوں اور خوابوں کو سسکا سسکا کے مار دیتے ہیں..... اوپر غریب..... اندر کڑھتا ہوا خون..... بلبلے اور چند چھوٹی چھوٹی خواہشیں..... جو بھاپ بن کر اڑتی رہتی ہیں..... آخر میں وہی ہڈیوں کا پنجر..... نایابیوں اور حسرتوں کی کھرچن کے سوا من میں بچتا ہی کیا ہے؟..... پھر ایک دن جب زندگی ناراض ہو کر اس کے جسم کو بے جان کر کے چھوڑ جاتی ہے تو انسانیت کے غم سے چھلکتے ہوئے چند وجود سستے کفن دفن کا انتظام کر کے گناہوں کی ڈسٹ بین قبرستان میں خالی کر کے نیکیوں کے پہاڑ سروں پہ اٹھائے واپس آ جاتے ہیں..... اور غریب؟..... وقت کے فرش پر گری ہوئی چائے کی طرح صاف ہو جاتا ہے..... کہ زندگی میں دوسروں پر بوجھ اور موت کے بعد بھولی بسری یاد..... چائے روزانہ گرتی ہے..... معاشرہ روزانہ پانی بہا کر وائپر پھیر دیتا ہے..... اس شکستہ مکان پر بھی غربت کا آسیب سوار تھا.....

●●●

غم ناک سسکیاں در و دیوار کی درزیں پھاڑ کر اس کے سینے میں خنجر کی طرح پیوست ہو گئیں تو اس کا ہاتھ بے اختیار دروازے کی طرف بڑھ گیا اور دستک دے ڈالی.....

''بچے کیوں رو رہے ہیں؟..... کیا پریشانی ہے.....؟''

''بھوک سے بے تاب ہیں۔''

''کیا گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں.....؟''

''نہیں..... کچھ بھی نہیں۔''

''ہنڈیا میں کیا پک رہا ہے؟.....''

(خاموشی..... طویل خاموشی)

''ہنڈیا خالی ہے..... پانی ابل رہا ہے.....''

''صرف پانی.....؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

وہ جلدی سے پلٹا..... موتی اس کی آنکھوں سے ڈھلک رہے تھے..... کچھ دیر بعد وہ لوٹا، اس کی کمر خوردونوش کی اشیاء کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی..... زمین و آسمان دونوں اس کی تائید کو جھکے ہوئے تھے.....

چند ٹکڑے تھے گوشت کے جو ابلتے ہوئے پانی میں ڈالے گئے، کچھ تیل اور کچھ پسے ہوئے گیہوں..... کھانا تیار تھا..... بچے جو بھوک سے بے تاب تھے بے طرح و انداز کھانے لگے..... اس نے اپنی چادر بچھائی اور وہیں کچھ فاصلے پر بیٹھ رہا..... اسے بھی دنیا سے کچھ لینا تھا..... وہ دنیا کی تعظیم ترین خوشی حاصل کرنے جا رہا تھا..... بھوک مرنے کے بعد بے تاب بچوں کی نوخیز مسکراہٹیں..... جن لبوں پر ابھی فاقے اور افلاس کا تسلط تھا، اب وہاں مسرتوں نے ہجوم کرنا تھا..... کتنی عظیم خوشی تھی یہ..... انمول اور بیش بہا.....

بقیہ: ص 26 پر

شکر گزار مومن عافیت سے قریب تر ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

اس کے جاتے ہی ثناء نے بے چینی سے لفافہ کھولا اور اس میں موجود تحریر پڑھنے لگی۔

''تمہیں میرے اس انداز میں پیغام دینے پر حیرت ہو رہی ہوگی، ہونی بھی چاہیے مگر اس طرح پیغام بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ میں تمہیں بتا دوں کہ اب میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے، اگر تمہارے پے در پے فون نہ آ رہے ہوتے تو شاید میں تمہیں یہ پیغام بھی نہ بھیجتا۔ مجھ پر اب یہ حقیقت آشکارہ ہوئی ہے کہ عشق مجازی کتنا سخت گناہ ہے ورنہ اس سے پہلے تو میں اِسے کھیل سمجھتا تھا کہ کچھ ٹائم ایک کے ساتھ پھر دوسری۔ اور یہ حقیقت کیسے واضح ہوئی تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں نے ایک اللہ والے بزرگ کی مجلس میں جانا شروع کر دیا، عنقریب میں ان سے بیعت ہو جاؤں گا، پہلی دفعہ تو اتفاقاً ہی چلا گیا تھا مگر وہاں جا کر میری دل کی دنیا ہی بدل گئی، وہاں عشق مجازی کی تباہ کاریوں کے بارے میں وعظ ہو رہا تھا مجھے اپنا پورا وجود گناہوں کی دلدل میں دھنسا ہوا محسوس ہو رہا تھا، پتا چلا کہ سکون و چین کیا ہوتا ہے، میری پہلی زندگی جہنم کی سی زندگی تھی، مجھے اب احساس ہوا دنیا کی محبتیں تو بس فریب کاریاں ہیں، اصلی محبت تو اللہ تعالیٰ کی محبت ہے۔ میں نے اس گناہ سے توبہ کر لی ہے، میں اپنے دل کو اپنے مالک کی یاد کے لیے خالی رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ

اختر وہی حیات حقیقت میں ہے حیات
جو خالقِ حیات پر، ہر لحظہ ہو نثار

''یہ دین اک مسلمان کا قیمتی سرمایہ ہے، اسے سنبھال کے رکھنا، تم تو عالمہ ہو، تمہیں تو یہ ساری باتیں معلوم تھیں مگر پھر بھی۔۔۔ میں تم سے یہی کہوں گا اپنے دین کو سنبھالو، یہ چلا گیا تو سب کچھ چلا گیا، دین کو صرف سیکھنا ہی سب کچھ نہیں ہوتا اس پر عمل بھی ضروری ہے۔'' یہ الفاظ نہ تھے!! اک طمانچہ تھا جو ثناء کے منہ پر لگا۔

''کیا اس نے یہ سب نہیں پڑھا تھا؟ کیا اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کتنا اشد گناہ ہے پھر۔۔۔ پھر آخر یہ گناہ کر بیٹھی؟'' ثناء نے روتے ہوئے سوچا۔۔ ذہن کا دریچہ ماضی کی طرف کھلتا چلا گیا۔۔۔۔۔

''سمیرا! یہ اللہ والے بھی وہی کچھ بتائیں گے نا جو ہم نے پڑھا ہے پھر ہم خود بھی تو عمل کر سکتے ہیں''

''لوگ دین دار ہو کے بھی ایسی حرکت کرتے ہیں، رابعہ نے پتہ نہیں شرم و حیا کہاں گنوائی''

''ہاں رابعہ کو حقیر جانا تھا میں نے۔۔۔۔۔ اللہ والوں کی قدر نہ کی تھی، مجھے ان باتوں کا احساس دلایا بھی تو کس نے؟ جو خود کل تک گناہوں میں ملوث تھا۔۔۔ آہ۔۔۔'' ثناء کو ایسا لگا کہ اس کا ضمیر اس سے پوچھ رہا ہو۔ ''بتاؤ ثناء! کیا صرف پڑھ لینا کافی ہے؟۔۔۔ پھر تم نے دیندار ہو کے ایسی حرکت کیوں کی؟ شرم و حیا کہاں گنوائی تم نے'' مگر اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا، اسے ایسا لگا کہ اس کا وجود ذلت کی گہری کھائی میں گرتا چلا جا رہا ہے!۔۔۔ مگر

ظالم ابھی ہے فرصتِ توبہ، نہ دیر کر
وہ بھی گرا نہیں جو گرا اور سنبھل گیا

بقیہ: بے بسی کی ہنڈیا

وہ تھوڑی دیر بیٹھا..... غربت بھوکی بلی کی طرح خالی برتنوں کے پیچھے دبک کر بیٹھ گئی تھی..... مسکراہٹوں اور قہقہوں نے ان کے لبوں کو آلیا تھا..... اس نے مسکراہٹوں کو اپنی پرانی چادر میں لپیٹ کر سینے سے لگایا اور رحمت عالم کے قدموں میں انہیں نثار کرنے چل دیا..... یہ اس کی یومیہ کارکردگی تھی..... زندگی بھر کا اثاثہ..... اسے بھی تو رب کے سامنے پیش کرنے کو کچھ وسیلہ چاہیے تھا..... کتنے بے وقوف تھے قیصر و کسریٰ جو چند خوشیاں حاصل کرنے کے لیے سونے چاندی کے ڈھیر لگا دیا کرتے تھے..... حال آں کہ دنیا جہاں کی تمام خوشیاں اس رات غربت کے آنگن میں جوانی کی پہلی مانگ نکال رہی تھیں.....

●●●

وہ بائیس لاکھ مربع میل میں ہر سیاہ و سفید کا مالک تھا..... آگ، پانی، ہوا، مٹی بھی اس کے زیرِ نگیں تھے..... اسے خوشیاں کمانے کا ڈھنگ آ گیا تھا..... وہ خوشیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے آتا تھا..... تاریک راتوں میں اسے ان کہی باتیں سننے کی عادت سی ہو گئی تھی..... غم اور پریشانی اگر چھپے ہوئے ہوتے تو وہ رات کی تاریکی میں بھی انہیں ڈھونڈ نکالتا تھا..... غربتیں اس کے دروازے پہ خود آ کر دستک دے دیا کرتی تھیں..... رستے خود بلا لیتے تھے..... ہوائیں خود پکار لیا کرتی تھیں.....

آج غربت اُسی طرح خونخوار ہے، شاید پہلے سے بھی زیادہ بھیانک..... افلاس آج بھی تاریکی میں خدا کے کنبے کو مردہ سمجھ کر بھنبھوڑتا رہتا ہے..... فاقہ اور تنگ دستی آج بھی بے آسرا لوگوں کو کاٹتی ہے..... وقت کے فرش پر معمول کے ساتھ چائے گرتی ہے..... رستے بلاتے ہیں..... ہوائیں پکارتی ہیں.....

کیا غربت کا آسیب کسی کو نظر نہیں آتا..... ؟؟؟

ہواؤں کی سرگوشیاں سنتا ہے کوئی..... ؟؟؟

بے تاب خوشیاں کسی کے در پر پچھلے پہر دستک تو نہیں دیتیں..... ؟؟؟

سنتے ہو کچھ..... ؟؟؟ ہے کوئی سننے والا..... ؟؟؟ گوش بر آواز..... !!!

بقیہ: شارٹ کٹ کلچر

سماجی، معاشی، مذہبی اور سیاسی ضروریات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایک نصاب تیار کرتے ہیں تاکہ اس مقررہ نصاب کو دیانت داری سے پڑھ کر نوجوان ترقی کی راہوں پر گامزن ہو سکیں اور ان میں آنے والے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتا کہ ملک کی ترقی اور وقار میں اضافہ ہو، مگر افسوس یہ ہے کہ ہم علم کے گنجِ گراں مایہ کو نظر انداز کر کے اختصار پسندی کی لت میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

مقرر نصابی کتب سے بیگانگی نہ صرف یہ کہ ہمارا ذاتی نقصان ہے بلکہ پوری قوم سے خیانت کے مترادف ہے کیونکہ ''شارٹ کٹ کلچر'' کے پیروی سے ڈگری بردار (علم و دانش سے تہی دست) تو تھوک کے حساب سے پیدا ہوں گے مگر اہلِ علم اور ماہرین کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ مستقبل میں یہی ڈگری بردار ملک کے اربابِ بست و کشاد قرار پائیں گے اور قوم کی ''خدمت'' کریں گے جیسا کہ گزشتہ تین دہائیوں سے ہماری قوم کی ''خدمت'' کی جا رہی ہے۔

ان امدادی کتابچوں پر تکیہ کرنا طلباء میں علمی صلاحیتوں کے نقصان کا سبب بن رہا ہے۔ ان کی وجہ سے طلباء اور اساتذہ کے درمیان فاصلے بڑھے ہیں اور ان کتابچوں کے شائع ہونے کے بعد تعلیمی میدان میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی بلکہ زوال آیا ہے۔ اگر کچھ دیر کے لیے ان نوٹس کے وجود کو طلباء کے لیے ناگزیر مان بھی لیا جائے تو بھی ان کی تصحیح سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اربابِ نظر اور نگران اداروں کو چاہیے کہ ان پبلشرز کو مذکورہ امدادی کتب کے مسودوں کی قبل از اشاعت پروف ریڈنگ کروانے کا پابند بنائیں اور خلاف ورزی کی صورت میں ان کے خلاف قانونی کاروائی عمل میں لائی جائے تاکہ آئندہ کوئی اشاعتی ادارہ اس نوع کی علمی خیانت کا ارتکاب نہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسکولوں، کالجوں اور جامعات کے اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلباء میں نصابی کتب کی اہمیت کا شعور بیدار کریں اور ان امدادی کتابچوں پر بھروسہ کرنے کے رجحان کی حوصلہ شکنی کریں۔